سچی کہانیاں

مشتاق احمد

قومی کونسل برائے فروغ اردو

سچی کہانیاں

قاضی مشتاق احمد

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت	:	1997
تیسری طباعت	:	2010
تعداد	:	1100
قیمت	:	-/9 روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	771

Sachchi Kahaniyan

by

Qazi Mushtaq Ahmad

ISBN :978-81-7587-436-7

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، آر.کے. پورم، نئی دہلی-110066 فون نمبر: 26109746
فیکس: 26108159
ای-میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈس، 1397، بازار مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی-110006
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

پیارے بچو! علم حاصل کرنا وہ عمل ہے جس سے اچھے برے کی تمیز آجاتی ہے۔ اس سے کردار بنتا ہے، شعور بیدار ہوتا ہے، ذہن کو وسعت ملتی ہے اور سوچ میں نکھار آجاتا ہے۔ یہ سب وہ چیزیں ہیں جو زندگی میں کامیابیوں اور کامرانیوں کی ضامن ہیں۔

بچو! ہماری کتابوں کا مقصد تمھارے دل و دماغ کو روشن کرنا اور ان چھوٹی چھوٹی کتابوں سے تم تک نئے علوم کی روشنی پہنچانا ہے، نئی نئی سائنسی ایجادات، دنیا کی بزرگ شخصیات کا تعارف کرانا ہے۔ اس کے علاوہ وہ کچھ اچھی اچھی کہانیاں تم تک پہنچانا ہے جو دلچسپ بھی ہوں اور جن سے تم زندگی کی بصیرت بھی حاصل کرسکو۔

علم کی یہ روشنی تمھارے دلوں تک صرف تمھاری اپنی زبان میں یعنی تمھاری مادری زبان میں سب سے موثر ڈھنگ سے پہنچ سکتی ہے اس لیے یاد رکھو کہ اگر اپنی مادری زبان اردو کو زندہ رکھنا ہے تو زیادہ سے زیادہ اردو کتابیں خود بھی پڑھو اور اپنے دوستوں کو بھی پڑھواؤ۔ اس طرح اردو زبان کو سنوارنے اور نکھارنے میں تم ہمارا ہاتھ بٹا سکو گے۔

قومی اردو کونسل نے یہ بیڑا اٹھایا ہے کہ اپنے پیارے بچوں کے علم میں اضافہ کرنے کے لیے نئی نئی اور دیدہ زیب کتابیں شائع کرتی رہے جن کو پڑھ کر ہمارے پیارے بچوں کا مستقبل تابناک بنے اور وہ بزرگوں کی ذہنی کاوشوں سے بھرپور استفادہ کرسکیں۔ ادب کسی بھی زبان کا ہو، اس کا مطالعہ زندگی کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر

فہرست

1	پیش لفظ	ڈائرکٹر
2	نرسمہا راؤجی کا بچپن	7
3	مدر ٹریسا	11
4	بمبئی کی خاتون میئر	15
5	ننھا ایڈیٹر	17
6	ننھی تیراک	21
7	لاری بیکر	24
8	ساجدہ باغبان	28
9	ایک ستّر سالہ بچّہ	31
10	مچھلیوں کا اُستاد	35
11	آئرین سینا	39
12	پھول پودوں کا دوست	42

13 آلن بورڈر 46

14 زنجیر 48

15 یوگی اروند آشرم 51

16 محبوب خان 54

نرسمہاراؤجی کا بچپن

وزیر اعظم نرسمہاراؤجی آندھراپردیش کے لاک نیپلی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کی پیدائش کی تاریخ ۲۸ جون ۱۹۲۱ء ہے۔ لاک نیپلی گاؤں ورنگل ضلع کے نرسام پیٹ تعلقہ میں ہے۔ ان کے خاندان کے لوگ اپنے نام کے ساتھ "پامول پرتی" لگاتے ہیں۔ ان کا خاندان ترویتی کے بالاجی ونکیٹشور کی پوجا کرتا ہے۔ اس لیے نرسمہاجی کے نام کے ساتھ "پی۔ وی" (پامول پرتی ونکٹ) لکھا جاتا ہے۔ آپ کے والد کا نام سیتارام راؤ تھا اور والدہ کا نام رکمایا یمّا تھا۔

بچپن میں ہی انھیں اُن کے رشتہ دار رتن یا یمّا نے گود لے لیا تھا۔ نرسمہا راؤجی نے ابتدائی تعلیم ورنگل میں اور ثانوی تعلیم دلور میں حاصل کی۔ آپ کا ذریعۂ تعلیم اُردو تھا۔

بچپن سے ہی آپ بحث ومباحثے، تقریریں کرنے گانے، بجانے اور اداکاری میں دلچسپی لیتے تھے۔ آپ کو فلمیں دیکھنے کا بھی شوق تھا۔ آپ ایک انتہائی ذہین طالب علم تھے۔ جو سبق ایک بار پڑھ لیتے وہ انھیں زبانی یاد ہو جاتا۔ بچپن میں آپ کو ایک ساز "مردنگ بجانے کا بھی شوق تھا۔

وینکیٹش راؤ اور راجو نامی ایک ادیب نے اپنی کتاب " دی رائیٹ پرائم منسٹر(THE RIGHT PRIME MIIIISTER) میں نرسمہا راؤجی کے بچپن کا ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ بچپن میں انھوں نے " لنکا دہن " ڈرامہ میں یہ منظر دیکھا کہ ہنومان اپنی دُم کی آگ سے ساری لنکا جلا دیتا ہے۔ گھر آکر ننھے نرسمہا نے اپنی کمر کے گرد ایک مضبوط رسّی باندھ کر دُم بنائی اور اُسے آگ لگادی۔ ہنومان کی طرح وہ اپنی جلتی ہوئی دُم کے ساتھ مکان کے اردگرد گھومنے لگے۔ مکان کے پیچھے میدان میں سوکھی گھاس رکھی ہوئی تھی۔ جلتی ہوئی دُم سے اُس گھاس کو آگ لگ گئی۔ آگ کے شعلے

بھڑکنے لگے۔ جب گھر کے تمام لوگوں نے یہ منظر دیکھا تو وہ دوڑتے ہوئے آئے اور آگ بجھائی مگر تب تک ساری گھاس جل کر راکھ ہوگئی تھی۔ یہ تو نرسمہاجی کے بچپن کی ایک معصوم شرارت تھی۔

اتفاق سے جب آپ ملک کے وزیراعظم بنے سارے ملک میں آگ لگی ہوئی تھی۔ کشمیر۔ پنجاب۔ مسجد مندر کے جھگڑے جل رہے تھے۔ مہنگائی الگ بڑھ رہی تھی نرسمہاجی نے اپنی سیاسی سوجھ بوجھ سے ملک کے بہت سے اہم مسلے حل کر دیے اور جو مسلے باقی ہیں انھیں بھی حل کرنے کے لیے مناسب کارروائی کی۔ راجیوگاندھی جی ملک کو ۲۱ ویں صدی میں لے جانا چاہتے تھے یعنی سَو سال آگے لے جانے کا سپنا دیکھ رہے تھے۔ ان کے بعد لوگوں کا اندیشہ تھا کہ شاید یہ سپنا ادھورا رہ جائے۔ نرسمہاجی نے اپنی محنت مشقّت اور کوششوں سے ہمارے ملک کو ایک ایسے مقام پر لاکر کھڑا کردیا کہ آج ہندستان کی ترقی کے ڈنکے ساری دنیا میں بج رہے ہیں۔ نرسمہاجی

اُردو اور انگریزی کے علاوہ اور بھی بہت سی زبانیں جانتے ہیں۔ آپ ایک بہترین مقرّر ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ نے اس دَور میں مُلک کی باگ ڈور سنبھالی جب ملک ایک مشکل ترین دور سے گزر رہا تھا۔

اُن کے وزیراعظم بن جانے سے یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ اس ملک کی جمہوریت اس قدر مضبوط اور پائیدار ہے کہ یہاں ایک چھوٹے سے دیہات میں پیدا ہوتے والا انسان بھی اپنی قابلیت کی بنا پر اتنے اونچے عہدے پر پہنچ سکتا ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو کے بعد ملک کے دوسرے وزیراعظم لال بہادر شاستری جی بھی ایک دیہات میں پیدا ہوئے تھے اور اپنی قابلیت کی بنا پر وزیر اعظم کے عہدہ پر پہنچے۔

مدر ٹریسا

مدر ٹریسا کے نام سے ہر شخص واقف ہے۔ اس بوڑھی اور جسمانی اعتبار سے کمزور نظر آنے والی خاتون نے انسانی خدمات کی وہ مثال قایم کی ہے کہ ان کا نام دنیا بھر میں مشہور ہو گیا ہے۔ ہماری سرکار نے انھیں ملک کا سب سے عظیم خطاب "بھارت رتن" دیا ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا انعام۔

"نوبل پرائز" بھی آپ کو مل چکا ہے۔

مدر ٹریسا کلکتہ میں عیسائی راہبہ کی حیثیت سے آئی تھیں۔ آپ نے کالی ماتا مندر کے قریب کالی گھاٹ میں "نرمل ہردیہ" نامی ادارہ کی بنیاد ڈالی۔ آپ نے

نہایت خلوص کے ساتھ انسانی خدمات انجام دینے کا کام شروع کیا وہ مجبور اور بیکس انسانوں کو سہارا دیتی تھیں۔ انھیں وہ سڑکوں، ندی کے کنارے یا کوڑے کرکٹ کے ڈھیر سے اٹھاکر اپنے ادارہ میں لاتیں۔ انھیں ہر طرح کا آرام پہنچانے کی کوشش کرتیں۔ دنیا میں جب بھی کوئی نیک انسان کوئی اچھا کام شروع کرتا ہے تو مطلب پرست اور شرارتی لوگ اُسے تکلیف پہنچاتے ہیں۔ مدر ٹریسا کو بھی اس قسم کے لوگوں نے پریشان کرنا شروع کردیا۔ شرارتی لوگوں کا خیال تھا کہ مدر ٹریسا محض دکھاوے کے لیے انسانی خدمت کا ڈھونگ رچا رہی ہیں۔ ان کا اصل مقصد کچھ اور ہے۔ یہ لوگ اپنی جھوٹی شکایت لے کر پولیس تھانہ گئے۔ تھانے کا پولیس افسر مدر ٹریسا کی خدمات سے واقف تھا۔ اس نے شرارتی لوگوں سے کہا کہ وہ ایک بار مدر ٹریسا کے ادارہ میں جاکر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ وہ کس طرح انسانی خدمت انجام دے رہی ہیں۔ پولیس

افسر اُن لوگوں کو اپنے ساتھ لے کر وہاں گیا۔ وہ سب اچانک وہاں پہنچے۔ انھوں نے دیکھا کہ مدر ٹریسا زخموں سے چُور ایک مریض کے زخم اپنے ہاتھوں سے دھوکر اس کی مرہم پٹّی کررہی ہیں — اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ کر وہ بے حد شرمندہ ہوئے اور واپس لوٹ گئے۔

ایک بار تو چند غنڈوں نے مدر ٹریسا کو گھیر لیا۔ ان لوگوں کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں۔ مدر ٹریسا بالکل بھی نہیں گھبرائیں بلکہ انھوں نے نہایت ہمت کے ساتھ اُن لوگوں سے کہا:۔

"اگر میری جان لینے میں تمھیں خوشی ملتی ہے
تو بے شک میری جان لے لو مگر ایک بات
یاد رکھو میں جب تک زندہ ہوں انسانوں
کی خدمت کرتی رہوں گی۔"

مدر ٹریسا کی بے خوفی اور اپنے نیک مقصد کے لیے جان کی بازی لگا دینے کا جذبہ دیکھ کر وہ لوگ حیران رہ گئے اور بے حد شرمندہ ہو کر واپس

لوٹ گئے۔

• مدر ٹریسا جہاں بھی جاتی ہیں دنیا ان کی راہوں میں پھول بچھاتی ہے۔ وہ ہمارے ملک کی ہی نہیں ساری دنیا کی ماں بن چکی ہے۔

بمبئی کی خاتون میئر

۱۹۹۲ء میں ایک بار پھر بمبئی میونسپل کارپوریشن کے میئر کا بڑا عہدہ ایک خاتون کو ملا۔ اُن کا نام ہے شریمتی نرملا سامنت پربھا ولکر۔ آپ بمبئی کی ۶۷ ویں میئر بنیں۔ اس سے پہلے ۱۹۵۶ء میں مسز سلوچنا مودی کو بمبئی کی پہلی خاتون میئر بننے کا اعزاز ملا ہے۔

مسز پربھاولکر کے والد واسودیو سامنت مزدور لیڈر تھے۔ بچپن سے انھیں سماجی سرگرمیوں کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ مسز پربھا ولکر ۱۹۹۱ء میں پہلی بار میونسپل کارپوریشن میں کارپوریٹر (کارپوریشن کی ممبر) منتخب ہوئیں۔ دوسرے ہی سال یعنی ۱۹۹۲ء میں آپ تعلیمی کمیٹی کی چیرمین بنیں۔

۱۹۹۶ء میں آپ کو بمبئی کی "پہلی شہری" یعنی میئر کا عہدہ ملا۔ میئر کارپوریشن کا سب سے بڑا عوامی نمائندہ ہوتا ہے۔ شہر میں اسے عزت کا مقام حاصل ہوتا ہے۔ مسز پربھاولکر نے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد قانون کی بھی ڈگری حاصل کی اور وکیل بن گئیں۔ بمبئی کے سدھارتھ کالج سے بھی آپ کا تعلق رہا۔ بمبئی کے میئر کا اتنا بڑا عہدہ اور اعزاز حاصل کرنے کے باوجود عام زندگی میں مسز پربھاولکر ایک سیدھی سادی خاتون ہیں۔ اس لیے بمبئی کے لوگ انھیں اپنے ہی خاندان کی ایک فرد سمجھتے ہیں۔ مسز پربھاولکر نے میئر کا عہدہ حاصل کرکے یہ ثابت کر دیا ہے کہ خواتین بھی اب کسی بھی میدان میں مردوں سے کم نہیں ہیں - وہ ہر عہدہ پر خدمات انجام دے سکتی ہیں۔

ننھا ایڈیٹر

۱۵ اکتوبر ۱۹۹۳ء کو بمبئی میں ایک شاندار جلسہ ہوا۔ یہ جلسہ بمبئی سے گجراتی زبان میں "منتھن" (سفر) نامی رسالہ جاری کرنے کی خوشی میں تھا۔ کسی نئے اخبار یا رسالہ کا شروع ہونا۔ کوئی نئی بات نہیں ملک میں ہر روز کوئی نیا اخبار یا رسالہ شروع ہوتا ہے۔ لیکن "منتھن" کے اس جلسہ کی ایک خاص اہمیت تھی کیوں کہ اس رسالہ کا ایڈیٹر ایک بارہ ۱۲ سالہ بچّہ تھا جو بلڈ کینسر کے موذی مرض میں مبتلا تھا۔ اس جلسہ میں بمبئی کے کئی معزز مہمان شامل تھے۔ ہندوجہ اسپتال کا وہ ڈاکٹر بھی تھا جو ملند دیسائی کا علاج کر رہا تھا اس کے اسٹاف کے لوگ نرس۔ وارڈ بائز وغیرہ بھی آئے تھے۔ دو ۲ روز پہلے ہی ملند اسپتال میں

لینا چیک اپ کرانے گیا تھا۔ اُسے اس بات کا علم تھا کہ وہ اس دنیا میں صرف چند دنوں کا مہمان ہے۔ بلڈ کینسر کے عام مریضوں کی طرح وہ بستر پر پڑے ہوئے موت کا انتظار کرنا نہیں چاہتا تھا بلکہ وہ چاہتا تھا کہ اس کی چھوٹی سی زندگی کا ہر لمحہ کوئی کام آجائے۔ ملند کے والد ہری دلیسائی گجراتی اخبار "جنم بھومی" کے معاون ایڈیٹر ہیں۔ ملند کو بچپن سے ہی پڑھنے لکھنے کا شوق تھا۔ چھوٹی سی عمر میں ہی وہ شاعری کرنے لگا تھا۔ بلڈ کینسر کے مریض کو تکلیف بھی بہت ہوتی ہے۔ ملند اپنی بیماری اور بیماری سے ہونے والی تکلیف کو بھول جانا چاہتا تھا اور اپنے آپ کو کسی اچھے کام میں مصروف رکھنا چاہتا تھا۔ اس کے والد کا تعلق اخباروں کی دنیا سے تھا اس لیے انھوں نے ملند کو ایک رسالہ نکالنے کا مشورہ دیا۔ ملند نے اپنے والد کے مشورہ پر عمل کیا اور "منتھن" کا پہلا شمارہ بازار میں آگیا۔ ملند کا خیال تھا کہ رسالہ نیا ہے اس لیے اس کی زیادہ کاپیاں نہیں بک سکیں گی۔ اس لیے اس نے صرف پندرہ سو کاپیاں

چھاپیں جو دو دن میں بک گئیں۔ ٹریول کارپوریشن نے دو سو کاپیاں منگوائیں لیکن ۱۵ سو کاپیاں پہلے ہی بک چکی تھیں۔

اخباری دنیا کے کام کاج میں مصروف ہوکر ملند دلیسائی اپنی بیماری کو بھول گیا لیکن موت تو گویا دروازہ پر ہی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ ملند دلیسائی کو اپنے ساتھ لے کر چلی گئی۔ ملند کا سفر ادھورا رہ گیا لیکن اخباری دنیا میں اس کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

ملند دلیسائی کی نظم "تلاش" کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ملند کو بھی اپنے خدا سے ملنے کی جلدی تھی اس نے خدا کو خود اس کے پاس آنے کی دعوت دی۔ وہ اپنے خدا کو تلاش کرتا ہوا اپنی منزل تک پہنچ گیا۔ موت جو اس کی منزل ہے۔

ملند دلیسائی کی نظم "تلاش" کا ترجمہ ہم شایع کر رہے ہیں۔ اسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی شاعری کتنی اچھی تھی۔ اگر وہ کچھ دنوں اور زندہ رہتا تو شاید اس کی شاعری میں اور نکھار آجاتا اور اس کا شمار دنیا کے مشہور شاعروں میں بھی ہوتا۔ ننھے ایڈیٹر کی حیثیت سے اس کا نام

تو ہمیشہ یاد رہے گا۔

تلاش

اے خدا!
میں تجھے کہاں تلاش کروں ؟
تو کہیں بھی نظر نہیں آتا
کچھ لوگ تجھے مورتیوں میں دیکھتے ہیں
کچھ لوگ تصویروں میں
کچھ لوگ کہتے ہیں تو ہر چیز میں موجود ہے
لیکن تُو مجھے کہیں بھی نظر نہیں آیا
میں ایک سیدھا سادا بچّہ ہوں
اے خدا!
میں تجھے کہاں ڈھونڈوں ؟
تو خود میرے پاس کیوں نہیں آتا ؟

ننھی تیراک

۵ دسمبر ۱۹۹۳ء کو کڑکڑاتی سردی تھی۔ اتنی سردی میں ۳۵ کلومیٹر تک سمندر کے ٹھنڈے پانی میں تیرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ پونہ کی گیارہ سالہ اسیمتا کرنک نے یہ کارنامہ کر دکھایا۔ یہ ننھی تیراک بےخطر پانی میں کود پڑی۔ تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ آٹھ روز پہلے اُسے تیز بخار ہو گیا تھا۔ اس لیے اس کے والدین یہ چاہتے تھے کہ مقابلہ کی تاریخ آگے بڑھا دی جائے۔ اسیمتا اپنے فیصلہ پر اٹل تھی۔ اس سے پہلے گوا کی نشا ماڈگاونکر نامی ایک بچّی نے "دھرمتر" سے گیٹ وے آف انڈیا تک کا فاصلہ ۹ گھنٹے ۵۴ منٹ میں طے کر کے ایک ریکارڈ قایم کیا تھا۔ اسیمتا کو یہ ریکارڈ توڑنا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ ضرور کامیاب

ہوگئی ۔ مقابلہ شروع ہوا۔ تیز ہواؤں کا زور تھا۔ اسیمتا ٹھنڈے پانی میں کسی مچھلی کی طرح تیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ سمندر کا پانی صاف نہیں تھا۔ پانی پر تیل کے تھر تھے۔ دھول اور کوڑا کرکٹ سے الگ پریشانی ہو رہی تھی۔ سمندر کی لہروں میں اُتار چڑھاؤ تھا۔ دوسرے دن "نیوی ڈے" تھا۔ اس لیے "وکرانت" نامی جہاز بھی وہاں سے گزرنے والا تھا۔ اس کی وجہ سے سمندر کی لہروں میں بہت زیادہ اتار چڑھاؤ ہو سکتا تھا۔ اگر سمندر کی لہروں میں اُتار چڑھاؤ زیادہ ہوگیا تو تیراک کے لیے اور بھی زیادہ مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں اس لیے اسیمتا نے اپنی رفتار اور تیز کر دی تاکہ وہ اپنی منزل پر جلدی پہنچ سکے۔ "گیٹ وے انڈیا" پر بہت سے لوگ اسیمتا کا نہایت بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ جوں ہی اسیمتا دور سے نظر آئی لوگ تالیاں بجا کر اس کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔ اسیمتا آگے بڑھتی رہی اور اس نے ریکارڈ توڑ دیا۔ اس نے ۹ گھنٹے ۳۵ منٹ میں ۳۵ کلومیٹر کا فاصلہ طے کر لیا یعنی نشاماڈ گاؤنگر

کے مقابلہ وہ دس منٹ پہلے پہنچ گئی۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں اس نے ایک شاندار ریکارڈ قایم کیا تھا۔ جو تیراکی کی تاریخ میں سنہرے لفظوں میں لکھا جائے گا۔ جوں ہی اسیمتا "گیٹ وے انڈیا" میں داخل ہوئی اس کا شاندار استقبال ہوا۔ اسیمتا کی خوشی کی انتہا نہیں رہی اس نے اپنی محنت اور لگن سے اپنی منزل حاصل کر لی تھی۔ اسیمتا کی منزل تو آسمانوں سے بھی آگے ہے۔

لاری بیکر

مہاتما گاندھی کی سادگی اور انسانی خدمت کے جذبہ سے صرف ہندستانی ہی نہیں بلکہ بہت سے دوسرے ملکوں کے لوگ بھی متاثر تھے۔ ان میں ایک نام لاری بیکر کا بھی ہے۔ لاری بیکر نے ۱۹۳۷ء میں انگلینڈ کے "برمنگھم اسکول آف آرکیٹکچر" نامی عالمی شہرت یافتہ اسکول سے آرکیٹیکٹ کی ڈگری حاصل کی اور اسی اسکول میں لیکچرر بن گیا۔ وہ پروٹیسٹنٹ عیسائیوں کی خدمت گزار سماجی تنظیم "کویکر" کا بھی ممبر تھا۔ اس تنظیم کے ممبران زخمی فوجیوں کی تیمارداری کے لیے جنگ کے میدان میں بھی جاتے تھے۔ لاری بیکر ہمیشہ سے آرکیٹیکٹ تھا۔ جیسا کہ تم جانتے ہو۔ آرکیٹیکٹ مکانات کی تعمیر کے نقشے بناتے ہیں اور ان ہی کی نگرانی میں عمارتیں

مکانات ۔ بنگلے تعمیر ہوتے ہیں۔ آرکیٹیکٹ ہونے کے علاوہ لاری بیکر سماجی خدمت گار بھی تھا۔ اس نے مریضوں کی تیمار داری اور فوری طور پر ہونے والے آپریشن کی بھی تعلیم حاصل کی تھی۔ اس زمانہ میں جاپان اور چین کے درمیان جنگ ہورہی تھی۔ بیکر تین سال تک چین میں رہا اور وہاں رہ کر اُس نے زخمی سپاہیوں کی خدمت اور تیمار داری کی۔ اس کے علاوہ جذام کے مریضوں کی بھی وہ تیمار داری کرتا تھا۔ اس زمانہ میں پانی کے جہاز سے انگلینڈ جانے کے لیے بمبئی کی بندرگاہ سے گزرنا پڑتا تھا۔ لاری بیکر بھی انگلینڈ جانے کے لیے بمبئی آیا۔ بمبئی سے انگلینڈ جانے والا جہاز تین مہینے بعد جانے والا تھا۔ جہاز کے انتظار میں لاری بیکر بمبئی میں ٹھہر گیا۔ اسی دوران مہاتما گاندھی کا قیام بمبئی کے برلا بھون میں تھا۔ لاری بیکر نے گاندھی جی کے بارے میں بہت کچھ سُن رکھا تھا۔ اُس کے دل میں گاندھی جی سے ملنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ وہ اُن سے ملنے کے لیے گیا ۔ مہاتما گاندھی اس نوجوان انگریز سے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ ملے۔ لاری بیکر نے اُس

وقت لمبے چوڑے جوتے پہن رکھے تھے۔ گاندھی جی نے
ان جوتوں کے بارے میں دریافت کیا تو لاری بیکر نے بتایا
کہ اس نے اس قسم کے جوتے بنانے کی تعلیم حاصل کی ہے۔
یہ جوتے پرانے اور استعمال کے ناقابل کپڑوں سے بنائے
جاتے ہیں۔ جب گاندھی جی کو یہ پتہ چلا کہ یہ نوجوان آرکیٹیکٹ
بیماروں اور جذامیوں کی بھی خدمت کرتا ہے تو وہ اُس
سے بے حد متاثر ہوئے۔ گاندھی جی نے اُس نوجوان انگریز
سے کہا " اس ملک کو تمھاری ضرورت ہے " بیکر نے مزاحیہ
انداز میں کہا " لیکن یہاں تو " چلے جاؤ " کے نعرے
گونج رہے ہیں " گاندھی جی نے کہا " یہ نعرے تمھارے
لیے نہیں ہیں " لاری بیکر گاندھی جی سے اس قدر متاثر ہوا
کہ ۱۹۴۵ء میں وہ اپنی شاندار ملازمت اور انگلینڈ کی عیش و
آرام کی زندگی چھوڑ کر ہندستان آگیا۔ ہندستان آکر وہ
جذامیوں کی خدمت میں جُٹ گیا۔ وہ اسی سلسلے میں کریم نگر،
فیض آباد۔ سانگلی اور دوسرے شہروں میں گیا۔ اس نے کم
خرچ میں مکانات اور کالونیاں بھی بنائیں۔ ہندستانیوں
کی مالی حالت اور پسند کو خیال میں رکھتے ہوئے اُس

نے چونا ۔ مٹی ۔ اینٹ ۔ پتھر اور بانس کا استعمال کر کے سستے مکانات بنائے ۔ اُس زمانے میں کیرل کے وزیراعلا اچیوت مینن تھے انھوں نے اپنی ریاست میں سستے مکانات بنانے کے لیے لاری بیکر کی خدمات حاصل کیں۔ لاری بیکر نے سستے مکانات بنانے کی تحریک کو نئی زندگی بخشی ۔ اس نے کئی کتابیں بھی لکھیں جن میں سستے مکانات بنانے کے طریقے سکھائے ۔ مٹی سے اچھے اور سستے مکانات بنانا۔ مکانات کو زلزلے کے اثرات سے محفوظ رکھنے کے طریقے وغیرہ کے بارے میں کتابیں لکھیں۔

۱۹۸۱ء میں لاری بیکر کی خدمات کے اعتراف میں انھیں ۔ "پدم شری" کے اعزاز سے نوازا گیا ۔ انھیں ہندستان کی شہریت بھی دی گئی ۔ اس سے لاری بیکر صحیح معنوں میں ہندستان کا شہری بن گیا حالاں کہ مہاتما گاندھی سے ملاقات کے بعد وہ دل سے ہندستانی بن چکے تھے ۔

ساجدہ باغبان

۲۵ر نومبر ۱۹۹۱ء کو مہاراشٹر کے ضلع ستارا کی باسکیٹ بال کھلاڑیوں کی ٹیم مقابلہ جیت کر اود ے پور ضلع کے ایک گاؤں بارسی سے واپس لوٹ رہی تھی۔ اس ٹیم کا نام " اجنکیے جیم خانہ ٹیم" تھا۔ اس ٹیم کی کیپٹن تھی ۱۷ سالہ ساجدہ باغبان جو باسکیٹ بال کی بہترین کھلاڑی تھی۔ پوری امید تھی کہ ساجدہ ایک دن باسکیٹ بال کے میدان میں اپنے ملک کا نام روشن کرے گی۔ ساجدہ جیتنے کے لیے ہی کھیلتی تھی۔ ۲۵ر نومبر کے مقابلہ میں جیتنے کے بعد ساجدہ تھک گئی تھی۔ اس لیے وہ بس میں سو گئی۔ یکایک اس گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ جس میں وہ سب جا رہے تھے۔ ساجدہ کو پتہ بھی نہ چلا کہ کیا ہوگیا۔

جب آنکھ کھلی تو وہ اسپتال میں پڑی تھی اس کی ٹانگ بُری طرح زخمی ہو گئی تھی ۔ اسے پندرہ دن بعد پتہ چلا کہ اب وہ کبھی باسکیٹ بال نہیں کھیل سکے گی۔ اس کے علاج کرنے والے ڈاکٹر نے بھی ساجدہ کو سخت ہدایت کی کہ وہ مستقبل میں باسکیٹ بال کھیلنے کا ارادہ دل سے نکال دے۔ یہ اب ممکن بھی نہیں ہے۔ یہ سن کر ساجدہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔ جو لڑکی باسکیٹ بال کے کھیل میں عالمی سطح پر ملک کا نام روشن کرنے کا خواب دیکھ رہی تھی وہ بیساکھیوں کی محتاج بن گئی ۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر اُس کے قریبی رشتہ داروں نے اپنے بچّوں کو باسکیٹ بال سے دور رہنے کا مشورہ دیا۔ لیکن ساجدہ کے ارادے پکّے تھے ۔ وہ ذرا بھی نہیں گھبرائی۔

وہ گھر میں ہی ورزش کرتی رہی ۔ اس کے والد نے گھر ہی میں ورزش کی مشین بھی لگا دی تھی۔ آٹھ مہینے تک ساجدہ بیساکھیوں کی محتاج رہی ۔ اس نے گھر میں بیٹھے رہنے کی بجائے میدان میں جا کر بچّوں کو باسکیٹ بال کھیلنا سکھانے کا فیصلہ کیا۔ شولا پور میں میٹر کپ

کا مقابلہ تھا۔ ساجدہ اپنی ٹیم کے ساتھ کوچ کی حیثیت سے شولا پور گئی۔ مقابلہ شروع ہوا۔ ساجدہ ٹیم کے کھلاڑیوں کا کھیل دیکھ رہی تھی۔ یکایک اسے ایسا لگا جیسے کھیل کا میدان اُسے اپنی طرف بُلا رہا ہے۔ ساجدہ بے خطر میدان میں کود پڑی اور چالیس منٹ تک کھیلتی رہی۔ اس کی ہمت اور حوصلہ دیکھ کر اس کا علاج کرنے والے ڈاکٹر تک حیران رہ گئے۔ ساجدہ کا اپنے آپ پر اعتماد لوٹ آیا تھا۔ وہ اودے پور ضلع کے بارسی گاؤں کے ٹورنامینٹ میں حصّہ لینے کے لیے بھی گئی جہاں وہ بھیانک حادثہ ہوا تھا۔ ساجدہ نے ویسٹ زون چمپین شپ کے مقابلہ میں بھی حصّہ لیا اور کوچی کے ملک گیر مقابلہ میں مہاراشٹر کی نمائندگی بھی کی۔ وہ دن دور نہیں جب ساجدہ باغبان کا نام دنیا کی بہترین باسکیٹ بال کھلاڑی کی حیثیت سے مشہور ہو جائے گا۔ اگر ارادہ مضبوط ہے تو اُسے آگے بڑھنے سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی ہے۔

ایک ستّر سالہ بچّہ

عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ٹکٹ جمع کرنے کا شوق بچّوں کا کھیل ہے۔ بمبئی کے ستّر سالہ وین۔ این۔ ککلرنی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنا بچّوں کا کھیل نہیں ہے بلکہ اس کے لیے زبردست محنت اور مشقّت کرنا پڑتی ہے۔ ککلرنی گزشتہ چالیس برسوں سے نہ صرف ٹکٹ جمع کر رہے ہیں بلکہ انھوں نے اس کارآمد مشغلہ کے بارے میں تین ہزار سے زیادہ مضامین بھی لکھے ہیں جو دنیا بھر کے رسالوں میں شایع ہوئے۔ ککلرنی دس برس تک جرمنی میں بھی رہ چکے ہیں۔ وہاں کے ایک اخبار میں وہ ٹکٹوں کے بارے میں مضامین لکھتے تھے اور اس سے انھیں اچھی خاصی آمدنی

ہو جاتی تھی۔ انھوں نے یوروپ میں فرانس۔ بلجیم۔ یوگوسلاویہ کا بھی دورہ کیا اور وہاں کے ڈاک کے محکمے کے افسران سے ملاقات کرکے ٹکٹوں کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ سوئزرلینڈ کے پوسٹ آفس میں کام کرنے والی ایک خاتون سے ان کی جان پہچان ہو گئی۔ وہ خاتون انھیں وہاں کے ٹکٹ بھجواتی تھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے ساٹھ۔ ستّر ممالک میں قلمی دوستی سے کئی دوست بنائے۔ دیکھتے دیکھتے ان کے پاس مختلف ممالک کے تین چار ہزار ٹکٹوں کا ذخیرہ جمع ہو گیا۔ ایک بار انھوں نے جرمنی سے پنڈت نہرو کو ایک خط لکھا کہ جرمنی میں پنڈت جی کی لکھی ہوئی کتابیں نہیں ملتی ہیں۔ پنڈت جی نے انھیں اپنی بہت سی کتابیں بھجوادیں۔ جب پنڈت جی جرمنی کے دورے پر آئے تو مسز اندرا گاندھی ان کے ساتھ تھیں۔ مسز گاندھی نے کلکرنی کو یاد کیا۔ کلکرنی مسز گاندھی سے ملے اور ان سے گزارش کی کہ وہ پنڈت جی سے ایک پیغام لکھوا دیں۔ پنڈت جی نے ایک پیغام دیا جو جرمنی کے کئی اخبارات میں شایع ہوا۔ اس طرح کلکرنی کی مسز اندرا گاندھی سے جان پہچان

ہوگئی ۔ ان کا پنڈت جی کے نام جرمنی سے لکھا ہوا خط مددگار ثابت ہوا۔ ثابت یہ ہوا کہ خط و کتابت کے ذریعہ بھی بڑے لوگوں سے جان پہچان ہو سکتی ہے قلمی دوستی بہت فائدہ مند ہوتی ہے۔ قلمی دوستوں سے ان کے ممالک کے ٹکٹ ملنے میں بھی آسانی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ممالک غیر میں ایسے کئی ادارے ہیں جو باقاعدہ ٹکٹ بھی۔ سپلائی کرتے ہیں بلکہ نایاب ٹکٹوں کا نیلام بھی کرتے ہیں۔ برٹش گیانہ کے ۱۸۵۶ء میں لگائے ہوئے ایک پینس قیمت کے ٹکٹ کی قیمت ۱۹۸۰ء کے ایک نیلام میں دو لاکھ پچاس ہزار ڈالر ملی تھی۔

ہمارے ملک کے محکمہ ڈاک نے ۱۵/ اگست ۱۹۴۸ء میں مہاتما گاندھی کی تصویر کا ایک رنگین ٹکٹ جاری کیا تھا۔ اس کی قیمت دس روپیے تھی۔ آج یہ ٹکٹ نایاب ہے۔ ٹکٹ جمع کرنے کے شوقین اس ٹکٹ کو خریدنے کے لیے دس ہزار روپے تک دینے کو تیار ہیں۔

کلکرنی کا خیال ہے کہ مغرب میں ڈاک ٹکٹ جمع کرنا ایک مشغلہ ہی نہیں بلکہ ایک کاروبار بھی ہے۔ لوگ اس کاروبار سے ہزاروں روپئے کما لیتے ہیں۔ کلکرنی کے لیے ٹکٹ جمع کرنا

صرف ایک مشغلہ ہے۔ وہ کہتے ہیں جب میں اپنے ٹکٹوں کا ذخیرہ دیکھتا ہوں تو ان ٹکٹوں سے وابستہ کئی یادیں میرے سامنے آکر کھڑی ہو جاتی ہیں اور میں ان میں کھو جاتا ہوں۔کلکرنی ٹکٹ جمع کرنے والے شائقین کی رہنمائی کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔

مچھلیوں کا اُستاد

بمبئی کے گرگاؤں علاقہ میں ایک سات سالہ بچّہ رہتا تھا۔ اُس نے کہیں رنگ برنگی مچھلیاں دیکھیں اور انھیں حاصل کرنے کے لیے بے چین ہوگیا۔ اس کے والدین غریب تھے۔ وہ اتنی قیمتی مچھلیاں خرید کر اپنے معصوم بچّے کا شوق پورا نہیں کر سکتے تھے۔ بچّہ خود بھی ماں باپ کی مجبوری کو سمجھتا تھا۔ جب وہ کچھ بڑا ہوا تو اُس نے خود مچھلیاں پکڑنے کا ارادہ کیا۔ بمبئی سے بہت قریب پوائی نام کا ایک تالاب ہے۔ وہ مچھلیوں کی تلاش میں وہاں پہنچا۔ اتفاق سے مچھلیاں اس کے جال میں آگئیں۔ انھیں اُس نے بڑے پیار سے کانچ کے مرتبان میں پانی میں رکھا۔ انھیں دیکھ دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتا تھا۔

اُسے یہ بات معلوم نہیں تھی کہ مچھلیاں میٹھے پانی میں زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہتیں ان کے لیے سمندر یا تالاب کا کھارا پانی مناسب ہوتا ہے۔ جب بہت سی مچھلیاں مرگئیں تب اُسے اس بات کا پتہ چلا۔

وہ مچھلیوں کو زندہ رکھنے کے لیے سمندر کا کھارا پانی خود اپنے سر پر ہنڈا میں رکھ کر لاتا تھا۔

اس کے مکان سے کچھ فاصلہ پر کرافورڈ مارکیٹ ہے۔ جہاں طرح طرح کی مچھلیاں بکتی ہیں اُس نے اپنی جیب خرچ سے چھوٹی رقم بچائی اور "پلاٹی" نسل کی ایک بوڑھی مچھلی خریدی۔ پچاس پیسے قیمت کی یہ بوڑھی مچھلی اس کے لیے مبارک ثابت ہوئی اس مچھلی نے سات بچّوں کو جنم دیا اور مر گئی۔

اس زمانے میں ہمارے ملک میں مچھلیوں کے بارے میں معلومات دینے والی بہت کم کتابیں ملتی تھیں۔ اس بچّے نے جو اب جوان ہوگیا تھا انگلینڈ، اور امریکہ سے مچھلیوں سے متعلق کتابیں منگوائیں۔ پھر اُس نے مچھلیوں کی عادات و اطوار، اُن کی کھانے پینے کی ضرورتوں کو بڑے غور سے دیکھا،

انھیں وہ نوٹ کرتا گیا۔ اس کے دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ وہ خود مچھلیوں کی نئی قسم پیدا کرنے کا تجربہ کرے۔ دو برس کی انتھک محنت کے بعد وہ مچھلیوں کی نئی قسم پیدا کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

اس نوجوان کا نام ہے پندھری ناتھ ناولکر۔ جو آج مچھلیوں کی دنیا میں ایک قابلِ احترام شخصیت بن گیا ہے۔ اس نے مچھلیوں کی جو نئی نسل پیدا کی ہے اس قسم کی مچھلیوں کا نام 'ناولنکر' کے نام سے رکھا گیا ہے جو ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔ برٹش میوزیم نے بھی اسے قبولیت بخشی ہے۔ ناولنکر نے اپنا ذاتی میوزیم بھی شروع کیا ہے۔ جس میں سیکڑوں رنگ برنگی مچھلیاں موجود ہیں۔ جس شخص نے ایک بوڑھی مچھلی کی مدد سے اپنے کاروبار کی شروعات کی تھی آج اُس کے پاس تین سو سے زیادہ مچھلیوں کے شوکیس موجود ہیں۔ دنیا بھر میں ناولکر کی مچھلیوں کی مانگ ہے۔ ناولکر کی خدمات سے متاثر ہوکر بمبئی اکواریئم سوسائٹی نے " دھرم کمار سنگھ جی روٹیٹنگ ٹرافی" دی ہے۔ ناولکر وہ پہلے انسان ہیں جنھیں یہ ٹرافی ملی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد ایسی کوئی شخصیت

ہی سامنے نہیں آئی جسے یہ ٹرافی دی جائے۔ اس بات سے ناولکر کی بے مثال شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ناولکر اپنے شوق اور انتھک محنت کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور ہوگئے ہیں۔ انھیں اپنی محنت کا بھی بھرپور صلہ ملا ہے۔ وہ ایک خوش حال اور عزّت دار زندگی بسر کر رہے ہیں۔

آئرن سینا

تیز رفتاری سے موٹر چلانے کا کھیل موٹر اسپورٹس دنیا کا انتہائی دلچسپ اور سنسنی خیز مگر خطرناک کھیل ہے۔ اس کھیل میں جان سے ہاتھ دھونے کا بھی خطرہ ہوتا ہے۔ اس لیے اس کھیل میں حصّہ لینے والے کھلاڑی کا بہادر اور نڈر ہونا لازمی شرط ہے۔ دنیا کے سب سے زیادہ بکنے والے رسالہ "موٹر اسپورٹس" کے ایڈیٹر ڈیوڈ جینکسن نے لکھا ہے کہ برازیل کا رہنے والا کھلاڑی آئرن سینا جیسا انتہائی بہادر کھلاڑی نہ آج تک ہوا ہے اور نہ مستقبل میں اس کی جگہ کوئی لینے والا نظر آرہا ہے، تیز رفتار سے موٹر چلانے کے کھیل میں اس نوجوان نے اپنی محنت اور لگن سے ایک مخصوص مقام حاصل کرلیا تھا۔ وہ ڈو تیز رفتار موٹروں کے

درمیان سے اپنی کار نہایت کامیابی کے ساتھ آگے نکال لے جاتا تھا۔ جب وہ مقابلہ میں حصّہ لیتا سب کی آنکھوں کا تارا بن جاتا۔

۱۹۸۸ء میں وہ پہلی بار موٹر ریس میں اول آیا اور اس کے بعد ۱۹۹۴ء تک وہ ہر بار اوّل نمبر ہی آتا رہا۔ لیکن شاید وہ بہت مختصر زندگی لے کر آیا تھا۔ ایک مقابلہ میں ایک بھیانک حادثہ ہوا۔

اس کی تیز رفتار موٹر ایک سیمنٹ کی دیوار سے ٹکرا گئی وہ بُری طرح زخمی ہوگیا۔ ڈاکٹر اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود اُسے بچا نہ سکے۔ آئرٹن سینا تاریخ کا ایک ورق بن کر ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگیا۔

آئرٹن نے ۱۹۸۴ء میں پہلی بار مقابلہ میں حصّہ لیا اس وقت اس کی عمر تیرہ (۱۳) سال کی تھی۔ سترہ (۱۷) سال کی عمر میں وہ امریکہ کے ایک مقابلہ میں کامیاب ہوا ۱۹۸۸ء میں وہ ہونڈا ٹیم میں شامل ہوگیا اور کامیابی کی منزلیں طے کرتا رہا۔ اسی زمانے میں وہ اپنے وقت کا "سب

سے عمدہ کھلاڑی" تھا۔ اُسے کروڑوں ڈالر انعام میں ملے۔ اس کا شمار دنیا کے رئیس ترین لوگوں میں ہونے لگا۔ اپنے ملک میں تو وہ ہیرو تھا۔ لوگ اس کی راہوں میں آنکھیں بچھاتے تھے۔ جب اس کی موت ہوگئی اور اس کی لاش پیرس سے ہوائی جہاز کے ذریعہ برازیل لائی گئی تو گویا سارا ملک اس کے آخری دیدار کے لیے اُمڈ آیا۔ لوگوں کا اپنے آنسوؤں پر قابو پانا مشکل تھا۔ برازیل سرکار نے اس کی موت پر تین دن کا قومی سوگ منایا۔

برازیل کے صدر تک اُسے آخری سلام کہنے کے لیے بذات خود آئے۔ آئرین سینا کا نام موٹر ریس کی دنیا میں ہمیشہ یاد رہے گا۔

پھول پودوں کا دوست

انسان کو پھول پودے اور درختوں سے ہمیشہ پیار رہا ہے۔ ہر کوئی اپنے آنگن میں پھولوں کے پودے لگانا چاہتا ہے۔ لیکن آجکل تو شہروں میں کنکریٹ اور سیمنٹ کی عمارتیں بننے لگی ہیں۔ یہ شوق پورا کرنا مشکل ہوگیا ہے۔ لیکن دنیا میں آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنے مکان کے اردگرد، جہاں بھی جگہ ملتی ہے۔ پھول پودے اُگا لیتے ہیں۔

بمبئی کے مضافات میں بوریولی نامی علاقہ ہے۔ اس علاقہ میں سبھاش ورٹوڈکر نامی ایک صاحب رہتے ہیں۔ انھوں نے اپنے مکان کے احاطہ میں تین سو (۳۰۰) سے زائد مختلف قسموں کے پودے لگائے ہیں۔ اپنے

بچّوں کی طرح وہ ان کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب ہمارے ملک میں مختلف قسم کی جڑی بوٹیوں کو پہچاننے والے کئی ماہر موجود تھے لیکن آجکل ان کی تعداد نہیں کے برابر ہے۔ سبھاشں ان چند گنے چنوں لوگوں میں سے ایک ہیں۔ جنھوں نے جڑی بوٹیوں کی پہچان کرنے والے ماہر کی حیثیت سے اپنا مقام بنا لیا ہے۔ دراصل پیڑ پودوں سے محبّت کرنے کا شوق انھیں اپنے والد سے ورثہ میں ملا۔ اُن کے والد اپنے وطن ساونت واڑی سے کئی قسم کے پودے لاکر اپنے آنگن میں لگائے تھے۔ ننھا سبھاش ان پودوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے پھلتا پھُولتا دیکھتا تھا اور اس طرح ان کی پودوں سے دوستی ہوگئی۔

اس زمانہ میں پھولوں اور پودوں کی نمائش بمبئی کے راج بھون میں لگتی تھی۔ سبھاشں اس نمائش کو دیکھنے کے لیے خاص طور پر جاتے تھے۔ ذرا انھوں نے ہوش سنبھالا پودوں سے ان کی دوستی اور بھی زیادہ گہری ہوگئی۔ اب وہ بمبئی سے باہر بھی جانے لگے۔ انھوں نے بنگلور۔

کوچی ۔ بھوپال۔ اندور۔ بڑودہ جاکر وہاں کی بھی نرسریاں
(جہاں پودے اگائے جاتے ہیں) دیکھیں۔ ان کا مشاہدہ
کیا۔ ان کے بارے میں معلومات حاصل کی۔ بنگلور کے
لال باغ میں ہر سال جنوری اور اگست میں نمائش لگتی ہے۔
سبھاش کئی برسوں تک وہاں باقاعدگی کے ساتھ جاتے
تھے۔ انھوں نے کشمیر۔ کلو منالی جاکر وہاں کے پودوں کا
مشاہدہ کیا۔ ہماچل پردیش کے جنگلوں میں تو گویا انھیں
معلومات کا خزانہ مل گیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے
کئی کتابیں پڑھیں اور بہت سے رسالوں کے خریدار
بھی بنے۔ بنگلور کی انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ریسرچ سینٹر
میں انھوں نے داخلہ لے کر وہاں کا ایک کورس بھی پورا
کیا۔

سبھاش بمبئی کے ریزرو بینک میں ملازم ہیں۔ نوکری
کے اوقات کے بعد وہ اپنا تمام وقت پھولوں اور پھلوں
کی صحبت میں گزارتے ہیں۔ اپنے چھوٹے سے باغیچے
میں انھوں نے طرح طرح کے پھول پودے لگائے ہیں۔
چالیس قسم کے تو گلاب وہاں موجود ہیں۔ پھولوں کی

چند قسمیں انھوں نے ہوائی جزیروں سے درآمد کی ہیں۔ کئی ایسے پودے موجود ہیں جو مختلف بیماریوں میں علاج کے لیے مفید ثابت ہوئے ہیں۔ مثلاً ایک پھول جس کو وہ "بھوئی چافا" کے نام سے پہچانتے ہیں۔ وہ کان کی بیماریوں میں مفید ہے۔ "مدھوناشی" نامی ایک پودا بخار۔ کھانسی۔ سردی کی بیماری میں مفید ہے۔ کچھ پودوں کی پتّیاں مختلف کھانوں کا ذائقہ بڑھاتی ہیں۔ مثلاً "آل اسپائیل" نامی ایک پودے کے پتّے تو بریانی پکاتے ہوئے استعمال کریں تو بریانی کی لذّت اور بڑھ جاتی ہے "ٹِوشس پیپر" نامی ایک پودے کے پودوں میں تو کالی مرچ کا مزہ ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ انھوں نے انار۔لیمو۔اور برگد کے درختوں کے "بونزائی" (چھوٹے پودے) بھی لگائے ہیں۔ پانی میں اُگنے والے "ڈائی فن" جیسے پودے بھی یہاں موجود ہیں۔ سبھاش کا کہنا ہے کہ پھولوں اور پودوں کی صحبت میں انھیں بے حد خوشی ملتی ہے۔ ایک سنت نے کہا ہے ؎

درخت اور بیلیں میری رشتہ دار ہیں

آلن بورڈر

آسٹریلیا کرکٹ ٹیم کا سابق کپتان آلن بورڈر عالمی کرکٹ کی تاریخ میں دنیا کا سب سے "کامیاب کپتان" ثابت ہوا۔ اب وہ ریٹائر ہو چکا ہے لیکن کرکٹ کی تاریخ میں اس کا نام ہمیشہ یاد رہے گا۔ اس لیے بھی کہ اس نے اپنی ٹیم کو اپنی آٹھ سالہ کارگزاری میں "دنیا کی کامیاب ترین" ٹیم کا درجہ دلا دیا۔ ۱۹۹۳ء میں ۳۹ سالہ آلن بورڈر نے سنیل گاوسکر کا ریکارڈ توڑ دیا اور ٹیسٹ کرکٹ میں سب سے زیادہ رن بنانے کا اعزاز حاصل کر لیا۔ سنیل گاوسکر کا ریکارڈ دس ہزار ایک سو بیس (۱۰،۱۲۰) رنوں کا تھا اور آلن بورڈر دوسرے نمبر پر (دس ہزار رن بنانے کا ریکارڈ) تھا۔ مارچ ۱۹۹۳ء میں نیوزی لینڈ کے خلاف کھیلتے ہوئے سنیل گاوسکر کا ریکارڈ توڑ دیا اور اس طرح دوسرے

نمبر سے پہلے نمبر پر آ گیا۔ "ایک دن کے ٹیسٹ" میں بھی بورڈر نے سب سے زیادہ کھیلوں میں حصّہ لیا ہے۔ پانچ ہزار رن بنانے والے جو پانچ کھلاڑی ہیں ان میں ایک آلن بورڈر بھی ہے۔ ٹیسٹ میچوں میں ۱۵۶ کیچ لے کر آلن بورڈر نے "سب سے زیادہ کیچ لینے والا کھلاڑی" کا اعزاز بھی حاصل کیا۔

ہر کھلاڑی کو ایک دن رٹائر ہونا پڑتا ہے۔ آلن بورڈر بھی رٹائر ہو گیا ہے لیکن اس کا نام کرکٹ کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہے گا۔

زنجیر

بمبئی پولیس کے "بم اسکواڈ" میں چار پولیس انسپکٹر۔ آٹھ سب انسپکٹر۔ ۲۵ کانسٹیبل ہیں لیکن ان سب میں سب سے زیادہ شہرت "زنجیر" کو ملی۔ زنجیر کسی انسان کا نہیں بلکہ ایک کُتے کا نام ہے جو بو سونگھ کر آتشیں مادہ یا بم کا پتہ ٹھکانہ بتا سکتا ہے۔

زنجیر جب بم یا آتشیں مادہ کا پتہ لگانے والے پولیس دستہ میں شامل ہوا اس کی عمر صرف دو مہینے کی تھی۔ اس کا وزن ۲۵۰ گرام تھا اور رنگ سنہرا تھا۔ جب اس کی عمر چھ مہینے کی ہوئی اُسے باقاعدہ ٹریننگ دینے کا آغاز ہوا۔ ٹریننگ دینے کے لیے انگلش میڈیم یعنی انگریزی میں سمجھانے کا طریقہ چنا گیا۔ وہ صرف اپنے اُستادوں کا ہی حکم مانتا ہے۔ اُستاد اُسے جب" زنجیر!

سٹ" کہتے ہیں تو وہ بیٹھ جاتا ہے۔"SLEEP" کہتے ہیں تو وہ سوجاتا ہے۔ زنجیر کو سوا سال کی عمر تک بُو سونگھ کر آتشیں مادّہ (بم۔ بارود وغیرہ) تلاش کرنے کی ٹریننگ دی گئی۔ اس کے بعد اُس کا امتحان لیا گیا۔ اس امتحان میں اُسے سَو میں سے سَو مارکس ملے۔ زنجیر پر امتحان کی گھڑی اس وقت آئی جب بمبئی میں کئی جگہ دھماکے ہوئے۔ اس کے بعد پولیس کو آتشیں مادے کی جگہ جگہ موجودگی کے بارے میں فون آنے لگے۔ ایک مہینے کی مدت میں زنجیر نے تقریباً سَو مقامات پر آتشیں مادے کی تلاش میں پولیس کی مدد کی۔ کئی مقامات سے آر۔ڈی۔ایکس (ایک زبردست آتشیں مادہ) کے چھپائے گئے ذخیرے ڈھونڈ نکالے۔ اس طرح ملک کو مزید تباہی سے بچا لیا۔

"زنجیر" بم اسکواڈ میں سب کی آنکھوں کا تارا ہے۔ اُسے ہر روز کھانے کے لیے آدھا کلوگرام بغیر ہڈی کا گوشت۔ آدھا لیٹر دودھ۔ پاؤ کلوگرام اُبلی ہوئی سبزیاں۔ بریڈ دیے جاتے ہیں۔ تیل۔ نمک اور مصالے سے اسے سخت پرہیز ہے۔

یوں تو "زنجیر" پر خاص طور پر توجہ دی جاتی ہے لیکن اگر ذرا سی بھی بے توجہی ہو جائے۔ وہ بھونک کر آسمان سر پر اٹھا لیتا ہے۔

یوگی اروند آشرم

مدراس سے ۱۶۰ کلومیٹر کے فاصلہ پر یوگی اروند جی کا آشرم ہے ۔ جہاں ہر سال لاکھوں کی تعداد میں لوگ آتے ہیں ۔ یہاں لوگ سکون اور شانتی کی تلاش میں آتے ہیں ۔ یہ آشرم سب کے لیے کھلا ہے ہر ذات اور مذہب کے لوگ یہاں آ سکتے ہیں ۔

آشرم کی اپنی سات سو ایکڑ کی کھیتی ہے جہاں اناج اور سبزیاں اُگائی جاتی ہیں ۔ یہاں دودھ دینے والے جانور بھی موجود ہیں ۔ آشرم کا اپنا اسکول اور کالج بھی ہے ۔ ایک ماڈرن قسم کا چھاپہ خانہ (پریس) بھی موجود ہے جہاں یوگی اروند جی اور ماں میرا

کی کتابیں چھپی ہیں۔ یہاں یوگی اروند اور مدر میرا کی سنگ مرمر کی سمادھیاں ہیں۔ جن میں دن میں دو۔ تین بار قسم قسم کے پھولوں کی سجاوٹ کی جاتی ہے۔ یہاں ایک گول قسم کا "ماترومندر" بنایا جا رہا ہے۔ جس کی اونچائی ۲۲۵ فٹ ہے۔ مندر کے اوپری حصّہ میں ایک " دھیان مندر" ہے۔ اس مندر میں ایک وقت میں صرف سّو لوگوں کو اندر داخل ہونے کی اجازت ہے۔

یوگی اروند جی کا جنم ۱۵ اگست ۱۸۷۲ء میں ہوا۔ تھا۔ ۱۴ برس تک آپ نے انگلینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد آپ بڑودہ کے مہاراجہ گائیکواڑ کے سکریٹری بنے اور کئی برسوں تک خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد کلکتہ کے بنگال نیشنل کالج کے پرنسپل بن گئے۔ ۱۹۰۲ء سے ۱۹۱۰ء تک آپ نے سودیشی تحریک اور جنگِ آزادی میں حصہ لیا۔ ۱۹۱۰ء میں یوگی بن گئے۔ اور پانڈیچری میں آکر رہنے لگے اور اس آشرم کی بنیاد ڈالی مدر میرا نے آپ کی بہت مدد کی۔ آج اس آشرم کو

دُنیا بھر کے لوگ عزت اور احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہ آشرم دنیا بھر کے لوگوں کی عقیدت گاہ بن گیا ہے جہاں دُور دُور کے ملکوں سے لوگ کھنچے چلے آتے ہیں۔ آشرم کی اس دلکش ماحول میں انھیں یہ سبق ملتا ہے کہ زندگی سکون اور شانتی کے لیے ہے اور انسان کو اپنی اس چھوٹی سی زندگی میں اچھے کام کرنے چاہئیں۔

محبوب خان

کئی برس پہلے گجرات کے ایک گاؤں بلموریہ سے ایک نوجوان اپنی قسمت آزمانے بمبئی آیا۔ وہ بہت غریب تھا۔ تعلیم بھی معمولی تھی لیکن اس کے حوصلے بلند تھے۔ جب وہ بمبئی کے بوری بندر اسٹیشن (وکٹوریا ٹرمینس) پر اترا تو اس کی جیب میں صرف تین روپے تھے۔ وہ پیدل چلتا ہوا بمبئی کے کنیڈری برج علاقہ میں آیا جہاں مشہور فلم ساز خان بہادر ایرانی کا جیوتی اسٹوڈیو تھا۔ وہ نوجوان کسی طرح جیوتی اسٹوڈیو میں داخل ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ پہلی بار اُسے "علی بابا اور چالیس چور" نامی فلم میں بہت معمولی سا رول ملا۔ ایک دوسری فلم میں اُسے گھوڑ سواری کرنی تھی۔ اُسے گھوڑ سواری نہیں آتی تھی پھر بھی وہ ہمت کرکے گھوڑے پر سوار ہوگیا۔ اس نے نہایت بہادری

کے ساتھ اپنا شاٹ دیا۔ شاٹ ختم ہوتے ہی گھوڑے نے اُسے زمین پر پٹخ دیا۔ وہ بُری طرح زخمی ہوگیا لیکن ذرا بھی نہیں گھبرایا۔ اس کی بہادری اور ہمّت دیکھ کر سب حیران رہ گئے۔

فلموں میں چھوٹے چھوٹے رول کرتے ہوئے وہ فلموں کے دوسرے شعبوں میں بھی دلچسپی لینے لگا۔ اس نے ایک فلم کی ہدایت بھی دی۔ فلم کامیاب ہوگئی اور اس نوجوان کا نام فلمی دُنیا میں مشہور ہوگیا۔ اس نوجوان کا نام تھا محبوب خان! یہ وہی محبوب خان ہیں جس نے برسوں بعد "مدر انڈیا" جیسی بے مثال فلم بنائی۔

ہندستان کی پہلی رنگین فلم "آن" بھی محبوب خان نے بنائی تھی۔ اس فلم کا پریمیئر (یعنی پہلا شو) لندن میں ہوا تھا۔ اس طرح ہندستانی فلموں کو مغربی ممالک میں بھی پہنچنے کا موقعہ ملا۔ ہندستان کی پہلی سینما اسکوپ فلم "سن آف انڈیا" بھی محبوب خان نے بنائی تھی۔ آپ بہت دُور اندیش اور نہایت قابل ڈائرکٹر تھے۔ ان کی فلم "مدر انڈیا" ایک ایسی فلم ہے جس کا نام ہندستانی فلمی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہے گا۔ اس فلم کو "راشٹرپتی ایوارڈ" بھی ملا تھا۔

محبوب خان نے اپنی محنت لگن اور قابلیت کے بل بوتے پر کروڑوں روپیے کمائے۔ تین روپیے جیب میں لے کر آیا ہوا انسان ایک اسٹوڈیو کا مالک بھی بنا جس کی قیمت ہزار کروڑ سے کم نہیں ہے۔ فلمی دنیا میں اس قدر دولت، عزّت اور شہرت اس کے ساتھ ہی زبردست مقبولیت بہت کم لوگوں کو ملی ہے۔ محبوب خان آج اس دنیا میں نہیں ہیں۔ لیکن ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

نوٹ: طلبہ و اساتذہ کے لیے خصوصی رعایت۔ تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

شاہنامہ کی کہانیاں

مرتب: آصف نعیم صدیقی

صفحات: 96

قیمت: -/15 روپے

ہمارا سنیما

مصنف: پریم پال اشک

صفحات: 116

قیمت: -/17 روپے

ہمارے جہاز

مصنف: پریم پال اشک

صفحات: 168

قیمت: -/24 روپے

بدھ کی کہانیاں

مصنف: انیتا کھنہ

مترجم: صدیق الرحمٰن قدوائی

صفحات: 80

قیمت: -/65 روپے

آرٹ کی کہانی

مصنفہ: سیما پرویز

صفحات: 64

قیمت: -/12 روپے

جانباز ساتھی

مصنف: وکیل نجیب

صفحات: 200

قیمت: -/42 روپے

कौमी काउन्सिल बराए फरोग-ए-उर्दू जबान

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان